محترمی و مکرمی،

السّلام علیکم!

تمام ناظرین سے گزارش ہے کہ اس شمارہ کے مضمون "کم سن بچوں کی شادیاں" کے مطالعہ کے بعد اپنے خیالات و تاثرات مفتی محمّد سعید خان صاحب (دامت برکاتہم) کو info@seerat.net پر ضرور ارسال فرمائیں.

امید ہے کہ مطالعہ کے بعد آپ اسے مفید پائیں گے.

والسّلام

Respected Readers,

AsSalaamu 'Alaikum!

Please take the time to comment on the article of "Marriages of Youth" by Mufti Saeed Khan Sahib (دامت برکاتہم). We would appreciate reading what you learned, what you think of the article and what more you would like to know on this subject, any criticisms, etc.

Please send all your comments to info@seerat.net .

We hope that you find this article very beneficial.

WasSalaam

جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ / مئی 2011ء

رجوع الی القرآن

کم سن بچوں کی شادیاں

خدا پرستی یا خود پرستی

زندگی کا مقصد کیا؟

امام اہلِ سُنّت مولانا محمد عبد الشکور فاروقی مجدّدی رحمہ اللہ

مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کی علمی خدمات

جامعہ مدنیہ کریم پارک راوی روڈ لاہور

سلام پہنچے

مفتی محمد سعید خان

یمینیوں کا سلام پہنچے[1] ، کسی کے صدقے سلام پہنچے
سلام پہنچے، پیام پہنچے ، ہمیشہ پہنچے ، مدام پہنچے
وہ رَبّ جگوں کی جزاء میں ہم سے ، ہراُمتی کا سلام پہنچے
مدینہ بستی میں رہنے والے ، صلاۃ پہنچے ، سلام پہنچے
سحر کی بیداریوں کے صدقے ، تمازتوں کو بتانے والے
فرشتے لے کر چلیں جو اس کو ، تو ان سے پہلے ، سلام پہنچے
ابن ادم کے آسرے کو ، مُصْلحِ و مولائے کل کو
جو ذرہ ذرہ درود بھیجے، تو کل جہاں کا سلام پہنچے
پیام پہنچے کہ میرو سلطاں، تری روش سے یہ سب ہیں باغی
اب التماس دعا ہے تجھ سے ، تری دعا کو سلام پہنچے
پیام پہنچے کہ کملی والے ، نفاق ملت میں رَچ گیا ہے
بھنور میں ناؤ پہنچ گئی ہے ، یتیم اُمت؟ سلام پہنچے
پیام پہنچے کہ رن میں در آ ، بحرو بر میں ہے حشر برپا
امن کے جو یا ، عدل کے خواہاں ، ان عاصیوں کاسلام پہنچے
کتھا یہ کہنی ہے ، درِ غلطاں، سیہ چشماں وجان جاناں
جو ٹپکے نیساں توکوئی قطرہ ، صدف کو پہنچے ، سلام پہنچے
یاس وحرماں کی تاریک شب میں ، نوید صبح سنانے والے
سسکتے لوگوں کے رنج وغم کو مٹانے والے، سلام پہنچے
سعیدؔ سے یہ پیام پہنچے کہ قربتوں سے مزکّی کردے
اے بزم عرفاں سجانے والے، سلام پہنچے ، سلام پہنچے

[1] اشارہ ہے فسلام لك من اصحٰب الیمین.

علمی دینی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ

الحامد

لاہور

جلد نمبر: 3	جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ / مئی 2011ء	شمارہ نمبر: 11

رابطہ نمبر
• 0333-8383337
• 0333-8383336

E.Mail: alnadwa@seerat.net
www.seerat.net

زر تعاون

فی شمارہ: 30 روپے، ششماہی: 150 روپے، سالانہ: 300 روپے

بیرون ملک

امریکہ، تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ
ویسٹ انڈیز، ناروے وغیرہ 30 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط
بحرین، ایران، عمان، انڈیا وغیرہ 25 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش 20 امریکی ڈالر
اکاؤنٹ نمبر: 0060-0081-002374-01-9
الحبیب بینک پاکستان

پتہ برائے خط و کتابت و ترسیل زر
دفتر ماہنامہ الحامد: الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، مین مری روڈ، چھتر، اسلام آباد پاکستان 46001

مولانا نعیم الدین طابع و ناشر نے پرنٹ یارڈ پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ''الحامد'' لاہور سے شائع کیا

فہرست مضامین

ادار یہ

رجوع الی القرآن

مدیر کے قلم سے

حضرت اقدس شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور میں امت کو جو اس کا ایک بھولا ہوا فریضہ یاد، دلایا تھا اور ''رجوع الی القرآن'' کا صور پھونکا تھا، اس کی گونج آج ڈھائی سو سال کے بعد بھی صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس صور سے جو قیامت برپا ہوئی ہے، بحمدہ سبحانہ وتعالیٰ کتنے مردہ دل، زندہ ہوئے ہیں اور کتنی ہی تحریکات اور جماعتوں کو اس سے قیادت وقائدین نصیب ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم کو پڑھا گیا، سمجھا گیا۔ تراجم ہونے اور چند ایک تفاسیر بھی لکھی گئیں۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم ''یورپ سے ایک خط''[1] کے عنوان سے جو سوال نقل کرتے ہیں کہ یورپ سے کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ اس امت میں ایک ''قافلہ شوق'' ہے اور آپ اس قافلے کے ایک فرد ہیں اور اس ''قافلہ شوق'' کے سالار صاحب مثنوی حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ تو آپ یہ بتائیے کہ راہ احرار کے اس چراغ (مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ) نے عصر حاضر کو بھی کوئی پیغام دیا ہے؟ کیا عصر حاضر کی رہنمائی کے لیے، مولانا روم نے کچھ تجویز کیا ہے؟

اس سوال کا جواب علامہ اقبال مرحوم نے خود مثنوی ہی سے، اپنے مجموعہ کلام ''بال جبریل'' میں نقل کر دیا ہے۔

که نباید خورد و جو ہمچوں خراں   آہوانہ در خُتَن چر ارغواں
ہر کہ کاہ و جو خورد قرباں شود   ہر کہ نورِ حق خورد قرآں شود!

(گدھوں کی طرح گھاس اور جو نہیں چرنے چاہییں بلکہ تمہیں خُتَن (تاتار، چین کا وہ علاقہ ہے جہاں کے

---

[1] بال جبریل، ص: ۲۰۰

ہرن اپنے نافوں کی وجہ سے مشہور ہیں کہ ان سے اعلیٰ قسم کا مشک نکلتا ہے۔) میں ہرن کی طرح غذا حاصل کرنی چاہیے۔ دیکھو جو کوئی گھاس اور جَو چرتا ہے، وہ بالآخر ذبح کر دیا جاتا ہے اور جو کوئی نورحق سے سیراب ہوتا ہے، وہ قرآن بن جاتا ہے۔)

صرف یہی مقام نہیں، بلکہ انیسویں اور بیسویں صدی کے تمام قائدین اور دانشور جو بار بار اُمت کو قرآن کی رہنمائی کے اتباع میں پرونے کی کوشش کرتے اور دعوت دیتے نظر آتے ہیں، ان سب کی کوششوں اور دعوتوں میں، اس شخص اور دانائے روزگار کے صور کا اثر ہے، جس کا تذکرہ اداریے کی ابتدائی سطور میں کیا گیا ہے۔

اس دعوت عام ورجوع الی القرآن نے جہاں نہایت عمدہ اثرات مرتب کیے وہاں اس چمن میں کانٹے بھی اُگے اور بہت سے لوگوں نے قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر تحریر کیا، یا بیان کیا، تو وہ سوائے گمراہی کے مزید کچھ نہیں تھا۔

آج کی موجودہ نسل کا یہ سوال — صحیح ہے یا غلط اس کے اسباب اور وجوہ ایک الگ مستقل بحث ہے لیکن یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کی کس تفسیر کا مطالعہ کریں۔

ہمارے مکتبۂ فکر کا جو سرمایہ دیوبند سے آیا تھا، مدت ہوئی ختم ہو گیا۔ پچھلے چالیس برسوں میں عمومی طور پر اور بیس برسوں میں خصوصی طور پر جب سے ذرائع ابلاغ (کمپیوٹر اور انٹرنیٹ) کا چلن عام ہوا ہے۔ نت نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ زبانیں تبدیل ہو رہی ہیں اور سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ ہماری نئی نسلوں کے تقاضے ہم سے کچھ اور طلب کر رہے ہیں اور اس کمی کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ اھل السنۃ والجماعۃ کی طرف سے رہنمائی کا سامان میسر کیا جائے اور پھر کوئی تفسیر یا امہات کتب حدیث میں سے کسی کی شرح یا فقہ کا کوئی نیا مجموعہ مرتب کیا جائے جو تشنگان عصر حاضر اور نسل نو کی سیرابی کا سامان ہو۔

فی الحال اسلامی علوم پر جو کچھ بھی میسر ہے، وہ نوے فیصد سے زیادہ، دیوبند اور ڈابھیل سے حاصل شدہ سرمایہ ہے۔ تفسیر کے میدان میں جو کام کیا ہے وہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں ہی کا اثاثہ ہے وگرنہ اس ملک کو بنے ہوئے پینسٹھ برس گذرتے ہیں، ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ہم اھل السنۃ والجماعۃ نے تفسیر کے میدان میں کیا کسی قابل ذکر تفسیر کا اضافہ کیا ہے؟ یا حدیث شریف کے علم میں کسی بھی بڑی کتاب کی کوئی شرح اردو زبان میں لکھی گئی ہے، جو ان فتنوں پر بند باندھ سکے، جو فتنے عدم تقلید کی وجہ سے جڑ پکڑ چکے ہیں؟ یہ لمحہ فکریہ ہے۔ ہمارے مدارس سے ہزاروں نہیں، ان پچھلے پینسٹھ برسوں میں لاکھوں علماء فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں کتنے فی صد مفسرین، محدثین، فقہاء، مؤرخین، مصنفین اور صاحب علم خطباء تیار ہوئے ہیں؟

ہمارے مدارس میں جو حضرات مدرسین ''ترجمہ قرآن کریم'' پڑھاتے ہیں، ان کے لیے یہ بھی تو ضروری ہے کہ وہ عربی ادب سے نہایت گہری مناسبت رکھتے ہوں حتیٰ کہ ان کی عربیت علمی چیز کی بجائے ذوقی درجہ حاصل کر لے۔ سورۂ مدثر کی آیات کریمہ ''وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾'' کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ ''اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ آگ کیسی ہے؟ نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے''۔ لَا تُبْقِيْ کا ترجمہ ''نہ باقی رکھے'' کیا جاتا ہے حالانکہ عرب یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں ابقیٰ علی فلان اور اس کا ترجمہ عربی میں ہی یوں کرتے ہیں ''رَحِمَهٗ وَ اشفق علیه یعنی اس پر رحم کھانا اور شفقت کرنا۔ اگر اس محاورے کو ذہن میں رکھ کر آیت کریمہ (لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ) کا ترجمہ کیا جائے تو نہایت خوبصورت اور فصیح ترجمہ بنے گا۔

''وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾'' ''اور تم کیا سمجھے کہ وہ آگ کیا ہے؟ نہ رحم کھائے گی اور نہ چھوڑے گی'' یا پھر یہ کہ ''اور تم کیا سمجھے کہ وہ دوزخ کیا ہے؟ نہ ترس کھائے گا اور نہ چھوڑے گا۔''

ایسے ہی ہماری اس گذارش پر نہایت سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ جس مدرس نے بھی صفات باری تعالیٰ کو غور سے نہ پڑھا ہو اور ماتریدی عقائد میں اسے تصلب حاصل نہ ہو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ ترجمۂ قرآن کریم پڑھا سکے۔

ذات وصفات باری تعالیٰ کے متعلق عقائد کی مباحث جاننے اور سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے مدرس نے فلسفہ اور منطق کو بھی پڑھا ہو۔ کسی شخص کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ علم کلام میں الٰہیات کے باب کو اس وقت تک سمجھ سکے جب تک کہ اس نے منطق وفلسفہ کو ''گھوٹا'' نہ ہو۔ ہمارے درس نظامی سے جو نتائج وعواقب پر غور کیے بغیر منطق وفلسفہ کی کتابوں کا دھڑا دھڑ اخراج کیا گیا تو اس کا نتیجہ اب یہ نکلا ہے کہ ہمارے مدارس ان علماء سے خالی ہو چکے، جو علم کلام کو جانتے اور پڑھاتے تھے۔ رازی اور بوعلی سینا کی کتابیں تو ایک طرف رہیں اب تو ایسے بھی نہیں رہے جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حجۃ اللہ البالغۃ اور ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر رحمۃ اللہ علیہ کی ''دمغ الباطل'' اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ''الجہد المقل'' بھی کماحقہ سمجھا سکیں۔ جب تک منطق وفلسفہ کی قدیم کتابیں نہ پڑھی اور پڑھائی جائیں گی اس وقت تک علم کلام کا احیاء نہیں ہو سکتا اور جب علم کلام نہ آتا ہوگا تو ذات وصفات باری تعالیٰ کی مباحث سمجھنا تو درکنار، مطالعہ سے بھی نہ ''نکالی'' جا سکیں گی۔

جس شخص کو بھی علم کلام کا ادراک نہ ہو اور وہ اشاعرہ وماتریدیہ رحمہم اللہ کے اختلافات کو نہ جانتا ہو، وہ تو قرآن کریم کا سادہ سا ترجمہ بھی نہیں کر سکتا، تفسیر کا تو نام بھی مت لیجیے۔ اس کی ایک مثال بھی ملاحظہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کے آغاز میں ارشاد فرمایا ہے ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖ'' (سورہ بقرہ، آیت: ۲۶) اور ان الفاظ کا ترجمہ عام طور پر یہی کیا جاتا ہے ''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا'' لغوی اعتبار سے اس ترجمے پر قلم رکھنے کی جا نہیں لیکن ذوق سلیم پر یہ کتنا گراں گذرتا ہے۔ جن حضرات نے علم کلام اور عقیدے کو پڑھا تھا اور فلسفہ ومنطق نوک زباں تھے وہ اپنے علم کی روشنی میں اس آیت کریمہ کا صحیح تر اور فصیح ترین ترجمہ کیا کرتے تھے۔ اور ایسے ہی جب انہوں نے اپنی اپنی تفاسیر لکھیں اور علم کلام کی روشنی میں، اھل السنۃ والجماعۃ کے طے

شدہ عقیدے کی ترجمانی کی تو ذات وصفات باری تعالیٰ کی ایسی مباحث کے مقامات پر انہوں نے ترجمہ وترجمانیٔ قرآن کریم کا حق ادا کیا، اس آیت کریمہ پر ان کی تحریرات وتقریرات کا خلاصہ یہ کہ وہ کہتے اور لکھتے ہیں کہ وہ صفات جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں جب ان کا انتساب ذات باری تعالیٰ کی طرف کیا جائے گا تو پھر اس صفت سے مراد، صفت نہیں بلکہ اس کا نتیجہ ہوگا۔ مثلاً اس آیت کریمہ میں صفت حیاء کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ صفت (حیاء) اور اس کا مبداء (خوف) انسانوں کا خاصہ ہے اس لیے جب اس کا انتساب ذات خداوندی سے ہوگا تو پھر اس سے مراد حیاء کا نتیجہ اور غایت ہوگی نہ کہ مطلقاً صفت۔ اور حیاء کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اس فعل کو ترک کر دیتا ہے۔ چنانچہ صحیح وفصیح ترجمہ یہ بنے گا کہ اللہ تعالیٰ ترک نہیں کرتا، چھوڑتا نہیں (لَا یَسْتَحْیِ أَیْ لَا یَتْرُکُ)

حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر یہ بحث کی ہے۔ اس لیے ترجمہ وتفسیر قرآن کریم کا سبق صرف اور صرف ایسے اساتذہ کو دیا جانا چاہیے جنہوں نے ادبی اور کلامی مباحث اور فلسفہ ومنطق کو اچھی طرح پڑھا اور پھر اگر اساتذہ اپنے طلباء کو ایسی دقت نظر سے ترجمہ پڑھائیں اور ان کی تربیت کریں تو بہت سی گمراہیوں کا سد باب بھی ہوسکتا ہے اور اھل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے اور پیغام کو ترجمۂ قرآن کریم کے ذریعے پھیلایا بھی جاسکتا ہے اس سلسلے میں اگر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کے مجموعے ''مواعظ حسنہ'' میں وعظ نمبر: ۱۱ شرائط مفسر ومترجم کا مطالعہ بھی کر لیا جائے تو از مفید ثابت ہوگا۔ اہل اہتمام کو بھی چاہیے کہ جب تک کسی مدرس میں وہ صلاحیتیں اور علوم نہ ہوں، جن کا تذکرہ حضرت کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس وعظ میں فرمایا ہے، اسے ہرگز ترجمۂ قرآن کریم کا سبق نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ وہ دن لائے جب ہمارے مدارس میں وہ قدیم نصاب پڑھایا جائے جسے پڑھ کر حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند اور حضرت انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم جیسی ہستیاں علم کی آبیاری کرتی تھیں۔

☼......☼......☼

کم سن بچوں کی شادیاں

مفتی محمد سعید خان

صحیح بخاری میں حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا جب کہ ان کی عمر چھ برس کی تھی اور پھر نو برس میں ان کی رخصتی ہوئی اور مزید نو برس انہوں نے رفاقت نبوی میں گذارے۔[1]

گویا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا جب انتقال ہوا ہے تو ان کی عمر اٹھارہ برس تھی۔

اس واقعے پر بہت سے غیر مسلم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اتنی کم عمر لڑکی سے شادی کیوں کی گئی؟

اس اعتراض کا جواب ہر دور میں مسلمان مؤرخین اور سیرت نگاروں نے برابر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے غیر مسلم معترضین یا تو ان جوابات کو پڑھتے نہیں اور یا پھر یہ جوابات ان کی زبان میں ان تک نہیں پہنچے اور یا یہ کہ ہر دور کی ان کی نئی نسل اس اعتراض کو پڑھتی اور جڑتی ہے اور ان سے پہلے کے دور میں جو جوابات تحریر کیے گئے ہوتے ہیں، وہ انہیں سنجیدگی سے پڑھتے نہیں اور یا پھر یہ کہ اس اعتراض کو محض برائے اعتراض ہی کیا جاتا ہے۔

منجملہ اور جوابات کے ایک جواب یہ بھی ہے کہ اگر ہم سنجیدگی سے اس ماحول کا جائزہ لیں، جس ماحول میں یہ شادی ہوئی تو پھر یہ اعتراض ختم ہو جانا چاہیے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پوری رفعت شان

---

[1] عن عائشہ رضي اللـه عنه ان النبي صلى الله عليه وسلم تزوجها وهي بنت ست سنين ، وأدخلت عليه وهي بنت تسع، ومكثت عنده تسعاً. (كتاب النكاح ، باب إنكاح الرجل ولده الصغار، رقم الحديث:٥١٣٣)

کے باوجود جس معاشرے میں زندگی بسر کر رہے تھے، اسی معاشرے کی صحیح اور اعلیٰ اقدار وروایات کے بہر حال پابند تھے۔ عمومی طور پر بکریوں، گائے اور اونٹنی کا دودھ استعمال ہوتا تھا چنانچہ آپ بھی وہی دودھ استعمال کرتے تھے، اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ آپ نے بھینس کا دودھ کیوں نہیں پیا تو ظاہر ہے کہ وہاں کے معاشرے میں نہ بھینس پائی جاتی تھی اور نہ ہی اس کا دودھ استعمال کیا جاتا تھا۔ آٹے کو پانی سے گوندھ کر کبھی فتیر اور کبھی اس آٹے کا خمیر اٹھا کر اس سے خمیری روٹی پکائی جاتی تھی۔[1] اور آپ بھی وہ فتیری اور خمیری روٹی کھاتے تھے۔ اب کوئی یہ کہے کہ اس دور میں آٹے کو دودھ سے کیوں نہیں گوندھا گیا اور نہایت ملائم روٹیاں کیوں نہ تیار کی گئیں تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ وہاں پر یہ معاشرت تھی ہی نہیں اور اس دور کا تمدن ان علاقوں میں اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا۔

اس دور میں مکانات عام طور پر یک منزلہ اور دو منزلہ بنتے تھے۔ تیسری منزل نہیں ہوتی تھی۔ دو منزلہ مکانات کا ذکر متعدد روایات میں ملتا ہے۔[2] اب کوئی یہ اعتراض کرتا ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے سہ منزلہ مکانات کے بنانے کا حکم کیوں نہیں دیا یا اس دور میں ایسے مکانات کیوں نہیں بنتے تھے تو اس سے یہ کہا جائے گا کہ ہر دور کا اپنا ایک تہذیب وتمدن اور اس کا اپنا ایک خاص رنگ ڈھنگ ہوتا

---

[1] صحیح مسلم کی کتاب النکاح میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے معاملے میں یہ تذکرہ آیا ہے کہ وہ آٹے کا خمیر اٹھا رہی تھیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: قال فانطلق زید حتى أتاها وهي تخمر عجينها. (باب: زواج زينب بنت جحش، رقم الحديث: ١٤٢٨)

[2] عن افلح، مولى أبي أيوب، عن أبي أيوب: أن النبي ﷺ نزل عليه، فنزل النبي ﷺ في السفل، وأبو أيوب في العلو، قال فانتبه أبو أيوب ليلة، فقال: نمشي فوق رأس رسول الله ﷺ! فتنحوا، فباتوا في جانب، ثم قال للنبي ﷺ، فقال النبي ﷺ: السفل أرفق، فقال: لا أعلو سقيفة أنت تحتها، فتحول النبي ﷺ في العلو، وأبو أيوب في السفل. (صحيح المسلم، كتاب الاشربة، باب إباحة أكل الثوم، رقم الحديث: ٢٠٥٣).

ہے، جسے باقی ادوار حتیٰ کہ باقی ممالک اور علاقوں پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے ہی اس معاشرے میں نکاح اور ازدواجی زندگی کے اپنے طور طریقے اور معاشرتی اقدار تھیں، اگر کوئی شخص انہی اقدار کے مطابق ایک نکاح کرتا ہے تو پھر آخر وہی شخص کیوں مورد الزام ہے، باقی تمام معاشرہ کیوں نہیں؟ حضرت رسالت مآب ﷺ نے اس تہذیب وتمدن اور معاشرت میں صرف ان صورتوں اور احکامات کو تبدیل فرمایا تھا، جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بذریعہ وحی حکم دیا تھا اور یا پھر یہ کہ آپ نے اجتہاد فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس اجتہاد کی سرًا یا علانیۃً تصویب فرمادی تھی۔ حضرت اقدس شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور علامہ عبدالعلی صاحب مدراسی رحمۃ اللہ علیہ کا کتاب ''مسلم الثبوت'' پر حاشیہ ''فواتح الرحموت'' جس نے بھی غور سے پڑھا ہے، اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

اس دور میں لوگ اپنی کم عمر بچیوں کا نکاح بڑی عمر کے مردوں سے کیا کرتے تھے اور یہ بات ان کے معاشرے میں ہر طرح سے قابل قبول تھی۔ نہ ہی کوئی عیب شمار کیا جاتا تھا اور نہ ہی لوگ اسے کسی درجے میں بھی خلاف تہذیب یا بُرا جانتے تھے۔ تاریخ اٹھائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نکاح کے علاوہ بھی کتنے ہی نکاح لڑکوں اور لڑکیوں کی کم عمری ہی میں ہوئے تھے مثلاً

① حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قریش مکہ کے عظماء میں شمار کیے جاتے تھے یہ، حضرت خالد بن ولید اور حضرت عثمان بن طلحہ جن کے پاس بیت اللہ کی چابی رہتی تھی —— تینوں اکٹھے ۸ھ کے اوائل میں مدینہ منورہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے تھے اور ان کا شمار قریش کے ان چند سرداروں میں ہوتا تھا، جن کی فطانت اور احتیاط ضرب المثل تھی، ان کے والد عاص بن وائل بن سعید بن سہم نے —— جو غزوہ بدر میں بحالت کفر ہی مارے گئے تھے —— انہوں

نے اس عمرو بن العاص کا نکاح اس وقت کر دیا تھا جب ان کا بیٹا تقریباً دس برس کا تھا۔ عمرو بن عاص بن وائل سہمی کا یہ سنجوگ رائطہ بنت الحجاج بن منبہ السہمیہ سے ٹھہرا اور اس کے نتیجے میں اگلے برس جب ان کے ہاں پہلے بیٹے کی پیدائش ہوئی تو باپ (عمرو بن العاص) اور بیٹے کی عمر میں تقریباً گیارہ برس کا فرق تھا۔ انہوں نے اپنے اس بیٹے کا نام عبداللہ رکھا اور بعض روایات میں آتا ہے کہ عمرو رضی اللہ عنہ نے اپنے اس بیٹے کا نام اپنے والد (عاص) کے نام پر ''عاص'' ہی رکھا، لیکن جب ان کے اس بیٹے نے اسلام قبول کیا تو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کو بدل دیا اور ''عاص'' کی بجائے ''عبداللہ'' تجویز فرمایا[1]۔ اور یہی وہ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما ہیں، جن کا تذکرہ کتب احادیث و تاریخ میں کثرت سے ملتا ہے۔

غور طلب بات ہے کہ یہ شادی اس عرب معاشرے کی ایک شادی ہے، جس میں ابھی اسلام کی اور کفر کی تفریق شروع نہیں ہوتی تھی چنانچہ ایک عرب (عاص بن وائل بن سہم) اپنے بیٹے (عمرو بن العاص) کی شادی اس وقت کر رہا ہے جب اس کے بیٹے کی کل عمر تقریبا دس برس ہے۔

② کریز بن ربیعہ زمانۂ جاہلیت کے مشہور سرداروں میں سے ایک تھے اور ان کی شادی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو پھوپھی بیضاء بنت عبدالمطلب سے ہوئی تھی۔ جب ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے اس کا نام ''اروی'' رکھا، اس رشتے پر غور کیا جائے تو یہ اروی رضی اللہ عنہا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن ہوئیں اور پھر ان کی شادی، عفان سے ہوئی جن کے صاحبزادے امیر المؤمنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔ اس رشتے کے اعتبار سے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن (اروی رضی اللہ عنہا) کے بیٹے یعنی گویا کہ آپ کے بھانجے ہوئے۔

پھر انہی کریز اور بیضاء بنت عبدالمطلب کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا اور انہوں نے ان کا نام عامر بن کریز

---

[1] اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو سیر اعلام النبلاء، رقم: ۱۷ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما، ج:۳، ص:۷۹۔

رکھا۔اب یہ عامر بن کریز بھی حضرت رسالت مآب ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور امیر المؤمنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے حقیقی ماموں ہوئے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کے یہ پھوپھی زاد بھائی عامر بن کریز فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے لیکن دین کے اختلاف کے باوجود، ان تمام خاندانوں کے آپس کے رشتے منقطع نہیں ہوئے تھے۔اتنی لڑائیوں اور فتح وشکست کے باوجود یہ تمام حضرات اپنی اپنی رشتے داریوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور پھر حضرت رسالت مآب ﷺ تو سب سے بڑھ کر رشتوں کو جوڑنے والے ایک اور مشفق باپ کا منصب رکھتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ آپ جب ۷ھ میں عمرۃ القضاء کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ میں حاضر ہوئے ہیں تو آپ کے یہ پھوپھی زاد بھائی عامر بن کریز، جن کی عمر اس وقت بمشکل چار برس تھی، کو لے کر حاضر ہوئے۔آپ نے اپنے اس بھتیجے، کم سن عبداللہ بن عامر کو نہایت خوشی سے اپنی گود میں اٹھالیا۔حد درجہ محبت سے اپنا لعاب مبارک اس بچے کے منہ میں ڈالا۔عامر بن عبداللہ، چھوٹا سالڑکا اس نے جمائی لینے کے لیے منہ کھولا اور حضرت رسالت مآب ﷺ نے دوبارہ اس معصوم منہ کے کھلنے پر اپنا لعاب مبارک ڈالا اور فرمایا کیا یہ سُلَمِیُوں کا بیٹا ہے؟[1] عرض کیا گیا کہ جی ایسے ہی ہے تو ارشاد فرمایا:

هذا ابننا ، وهو أشبهكم بنا ، وهو مُسْقيً .

(تاریخ دمشق ، رقم ۳۴۳۹، عبداللّٰہ بن عامر بن کریز،حرف العین فی اسماء العبادله ، ج:۳۱،ص:۱۶۶)

پھر تو یہ (عبداللہ بن عامر بن کریز) ہمارا بیٹا ہے اور دیکھو تو تم میں سے اس کی شکل وصورت ہم سے کتنی ملتی جلتی ہے اور یہ بچہ تو بہت سیراب کرنے والا ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہما کو دوبارہ پیش کیا گیا اور اس وقت، اس بچے کی عمر تقریباً پانچ

---

[1] یہ غالباً اس نسبت سے فرمایا تھا کہ حضرت عامر بن کریز رضی اللہ عنہ نے دجاجہ بنت اسماء سے شادی کی تھی اور ان سے اس بیٹے عبداللہ نے جنم لیا تھا اور دجاجہ بنت اسماء کی گیارہویں پشت میں ایک صاحب آتے ہیں جن کا نام سلیم تھا تو اس بچے (عبداللہ بن عامر) کو اپنے ننھیال کی نسبت سے ارشاد فرمایا کہ کیا یہ ''سُلَمِیُوں'' کا بیٹا ہے۔

برس تھی تو اب اس کے والد حضرت عامر بن کریز رضی اللہ عنہ نے اسلام بھی قبول کیا اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اس بچے کے منہ میں اپنا لعاب مبارک ڈالا تو اس بچے نے جلدی سے وہ مبارک لعاب نگل لیا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ بیٹا تو بہت لوگوں کو پانی سے سیراب کرے گا۔ حضرت عامر بن کریز رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میرا یہ بیٹا (عبداللہ) پانچ، چھ برس کا رہا ہوگا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے منہ میں اپنا لعاب مبارک ڈالا تو یہ بچہ بار بار اس لعاب کو منہ میں گھماتا رہا اور پھر بار بار اسے حلق سے اتارتا رہا اس کی یہ حرکت دیکھ کر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہارا یہ بیٹا تو بہت پانی پلانے والا ہوگا۔

عربوں کی زمین ریتلی اور صحراؤں پر مشتمل تھی مگر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشن گوئی پوری ہوتی ہی رہی تاریخ میں آتا ہے کہ یہ عبداللہ پانی حاصل کرنے کی غرض سے کسی زمین پر ٹھوکر بھی مار دیتے تھے تو اس سے چشمہ پھوٹ پڑتا تھا۔ مکہ مکرمہ سے صرف ایک رات کی مسافت پر انہوں نے اپنا باغ لگوایا۔ وہاں بھی زمین سے پانی نکل آیا اور یہ جہاں بھی گئے، عمر بھر ہر مقام پر کنوئیں کھدوا کر لوگوں کو وافر مقدار میں پانی مہیا کرتے رہے۔

یہ حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز صغار صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بعد بصرہ کی امارت انہیں عطا فرمائی تھی اور پھر حضرت عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ کے بعد ایران کی امارت بھی انہیں ہی دے دی تھی اس طرح نیشاپور، اصطخر، اردشیر، کرمان، سجستان اور کابل تک کے گرد و نواح سب آپ کے زیر امارت تھے پھر ان کے دور امارت میں خراسان بھی فتح ہوا۔ تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے یہ ارادہ فرمایا کہ جو زمین اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ پر فتح کروائی ہے، میں اس سے احرام باندھ کر عمرہ ادا کرنے کے لیے حاضری دوں گا چنانچہ انہوں نے نیشاپور سے ہی احرام باندھ لیا اور عمرہ ادا کیا۔ اگرچہ ان کے اتنے طویل مدت

کے لیے احرام باندھنے کی اطلاع جب امیر المؤمنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے اسے مناسب نہیں سمجھا۔

ان عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہما کی عمر جب بارہ برس کی ہوئی تو انہوں نے والد حضرت عامر بن کریز رضی اللہ عنہ نے ان کی شادی کردی اور پھر اگلے برس جب ان کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا تو انہوں نے اس کا نام عبدالرحمٰن بن عبداللہ رکھا۔ اس لیے باپ اور بیٹے کی عمر میں صرف تیرہ برس کا فرق تھا۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی معاشرت میں چھوٹی عمر کے بچوں کی شادی، معاشرے کا معمول تھا اور اسے کوئی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وگرنہ ان رشتوں اور کم سنی کی اس عمر میں ماں، باپ بننے پر کوئی تو اعتراض کرتا۔ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے اپنے اسی بیٹے عبدالرحمٰن کے نام پر اپنی کنیت ابوعبدالرحمٰن تجویز فرمائی تھی اور پھر ان کا یہی بیٹا عبدالرحمٰن جمل کے موقع پر شہید ہوا تھا۔ رضی اللہ عنہم

(۳) یہی حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ جب جنگ جمل میں امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آئے، تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس شخصیت کے محاسن کا کھل کر اعتراف کیا اور فرمایا:[2]

> میری فوج والو! تم جانتے ہو آج میرا کن سے مقابلہ ہے؟ لوگوں میں سب سے زیادہ مجد و عزت والے اور صحیح معنیٰ میں طاقت ور اور جنگ جو شخص یعنی عبداللہ بن عامر سے، اور سب سے زیادہ بہادر اور دلیر شخص یعنی زبیر سے اور وہ جس کے جنگی

---

[1] فلما قدم رسول الله معتمرا عمرة القضاء، حمل إليه ابن عامر وهو ابن ثلاث سنين، فحكنه، وولد له عبد الرحمن وهو ابن ثلاث عشرة سنة. (سير أعلام النبلاء، عبدالله بن عامر، رقم:٦، ج:٣، ص:١٩).

[2] قال علي بن أبي طالب يوم الجمل: أتد رون من حاربت؟ أمجد الناس أو أنجد الناس، يعني ابن عامر، وأشجع الناس يعني الزبير وأدهى الناس طلحة بن عبيدالله. (تاريخ دمشق، حرف العين فی اسماء العبادلة، ج:٣١، ص:١٧٥).

داؤ پیچ سے لوگوں کے دل کانپتے ہیں، طلحہ بن عبید اللہ سے (رضی اللہ عنہم)

امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

جب ان کے انتقال کا وقت قریب آیا، تو کچھ دنوں تک بیمار رہے۔ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے، ان کی عیادت کے لیے آئے اور فرمایا عبداللہ ہمیں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر طرح کی تکلیف و دکھ سے محفوظ رکھے گا۔ کیونکہ آپ اپنے مہمانوں کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے اور ان لوگوں کے کام آتے تھے اور انہیں مال دیتے تھے، جن لوگوں سے نہ آپ کی کوئی رشتے داری ہوتی تھی، نہ آپ اور وہ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے تھے اور نہ ہی ان لوگوں کا آپ پر کوئی احسان ہوتا تھا کہ آپ اس کا بدلہ چکا رہے ہوں۔ اپنی حیات طیبہ میں حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ دمشق تشریف لے گئے۔ وہاں پر سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ امیر مقرر تھے۔ انہوں نے ان کا بہت شاندار استقبال کیا اور پھر ان کے اسی قیام کے دوران اپنی بیٹی ھند بنت معاویہ سے ان کی شادی کر دی۔[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بہت سمجھدار اور دانا انسان تھے۔ انہوں نے جب اپنی بیٹی ھند کی شادی کی ہے تو اس بچی کی عمر نو[9] برس تھی۔ انہوں نے اپنی اس بیٹی کی رہائش کے لیے اپنے گھر سے متصل ایک گھر بھی تجویز کیا اور بیٹی کو سمجھایا کہ بیٹی یہ آپ کا شوہر ہے اور آپ دونوں کا تعلق اللہ تعالیٰ نے درست قرار دیا ہے۔ اپنے شوہر کی مانتی رہیں۔[2]

---

[1] فلما خرج قال معاوية لا بنته لا تفعلي فإنما هو زوجك الذي أحله الله لك.(تاريخ الدمشق الكبيرلا بن عساكر،هند بنت معاوية بن أبي سفيان، رقم:٩٧٨١،ج:٧٤،ص:١٣٨).

[2] ولي البصرة لعثمان، ثم وفد على معاوية ، فزوجه بابنته هند.(سير أعلام النبلاء، عبدالله بن عامر، رقم:٦، ج:٣، ص:١٨)

اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اس عمر کی بچیوں کی شادی بخوشی کردی جاتی تھی۔ آج اگر یہ روایات اور معاشرے کا چلن بدل گیا ہے تو کسی بھی شخص کے لیے آخر یہ کیسے روا ہے کہ اس معاشرے کی اقدار پر اعتراض کرے اگر اس قدر میں لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے یا یہ ظلم ہوتا یا حقوق اللہ کی خلاف ورزی ہوتی تو یہ سب شادیاں کھلے بندوں، دن کی روشنی میں ہوتی تھیں، اس معاشرے کا کوئی فرد تو اعتراض کرتا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے اس داماد سے اتنی محبت تھی کہ ان کے انتقال پر فرمایا۔

''عبداللہ اب تمہارے بعد کون سی قابل فخر شخصیت ہمارے خاندان میں بچی ہے؟ اور عبداللہ تمہارے جائے پیچھے، دشمنوں کے مقابلے میں اب ہم کس کو پیش کیا کریں گے؟''[1]

(۴) حضرت ہشام بن عروہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ ان کی پیدائش ۶۱ھ میں ہوئی اور کتب حدیث میں ان کا تذکرہ بہت مقامات پر ملتا ہے۔ کبار تابعین میں سے تھے کیونکہ ان کے زمانے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت بڑی تعداد میں حیات تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ، سہل بن سعد، انس بن مالک اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا دور تھا اس لیے انہوں نے اس دور کو دیکھا بھی اور خوب علم بھی حاصل کیا۔ امام حدیث حضرت شعبہ، امام مالک اور سفیان سعید الثوری رحمۃ اللہ علیہم جیسے اکابران کے شاگرد تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کے سر پر ہاتھ بھی پھیرا تھا اور ان کے لیے دعا بھی فرمائی تھی۔

حافظ شمس الدین الذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ علم حدیث میں ان کی روایات غالباً ایک ہزار سے بھی زائد ہیں۔[2]

---

[1] توفي قبل معاوية سنة تسع وخمسين ، فقال معاوية: بمن نفاخر وبمن نباهي بعده. (سير أعلام النبلاء،عبداللہ بن عامر، رقم:٦ ، ج:٣،ص:٢١).

[2] وحديث هشام لعله أزيد من ألف حديث. (سير أعلام النبلاء،هشام بن عروة، رقم:١٢ ، ج:٦،ص:٤٧).

ان کے دادا یعنی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے یعنی عروہ تو ان کے والد تھے اور ان کے دوسرے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ان (ہشام) کے چچا تھے۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کے اس بھتیجے اور باقی خاندان کی شہرت بھی بہت عروج پر پہنچی۔

ایسے ہی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے ایک اور بیٹے منذر بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے جو ان کے چچا (منذر بن زبیر) ہی تھے اور انہوں نے اپنی بیٹی فاطمہ بنت منذر بن زبیر رضی اللہ عنہم کا رشتہ اپنے اسی بھتیجے (ہشام بن عروہ بن زبیر) کو دیا تھا۔

تاریخ میں اگر چہ اور روایات بھی ہیں لیکن ابن عدی نے اسماء الرجال پر اپنی مشہور کتاب "الكامل في ضعفاء الرجال" میں لکھا ہے کہ ہشام بن عروہ بن زبیر کی شادی جب اپنی چچازاد بہن فاطمہ بنت منذر بن زبیر سے ہوئی ہے تو فاطمہ بنت منذر کی عمر نو برس تھی۔[1] حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا خاندان اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا پر مسلمانوں اور عربوں کا مشہور گھرانا تھا۔ اگر کم سنی کی شادی اس معاشرے کے لیے کوئی عجیب اور انہونی بات ہوتی تو اس زمانے کے لوگ اعتراض کرتے یا یہ بات اچھالتے لیکن تاریخ کھنگال لیجیے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو اس قسم کے ازدواجی بندھن پر اعتراض کرتا ہو۔

۵ حضرت لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر اور احادیث و آثار کے آئمہ میں سے تھے۔ عبداللہ بن صالح مصری ان کے فتاویٰ، احادیث اور روایات کے کاتب تھے۔ کتب احادیث میں جہاں بھی عبداللہ بن صالح ابو صالح کاتب اللیث ثنا اللیث بن سعد رحمہم اللہ کی سند آتی ہے اس سے مراد یہی عبداللہ بن صالح ہوتے ہیں۔ آئمہ حدیث نے اس سند پر اعتبار کیا ہے اور عبداللہ بن صالح کی

---

[1] حدث عن امرأتي فاطمة بنت المنذر وأدخلت علي وهي بنت تسع سنين، وما رآها رجل حتى لقيت الله. (الكامل فی ضعفاء الرجال، محمد بن اسحاق بن يسار، مدني، رقم: ١٦٢٣ ج:٧، ص:٢٥٦).

احادیث سے استناد بھی کیا ہے۔ الغرض یہ تمام حضرات ثقہ اور اپنی باتوں میں سچے تھے۔

امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ انہی عبداللہ بن صالح یعنی اپنے کاتب کی روایت بیان کرتے تھے کہ ایک آدمی ان کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ اس کی دس سالہ بیٹی اُمید سے ہے۔[1]

اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں لوگ اپنی بیٹیوں کو نو 9 سال کی عمر میں بیاہ دیتے تھے اور اس بات میں انہیں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔

⑥ حضرت الامام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ اپنی احادیث، روایات اور فقہ میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے لگاّ کھاتے تھے۔ دونوں حضرات کا اگرچہ یکساں ادب اور احترام تھا اور اُمت ہمیشہ سے اُن دونوں حضرات کے فضائل ومناقب میں کتابیں تحریر کرتی رہی ہے البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو ایک تو شاگرد ایسے ملے جنہوں نے ان کے علم کو محفوظ رکھا اور پھر مشیت الٰہیہ بھی کارفرما ہوئی اور وہ امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ مقبول عام وخاص ہوئے لیکن امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ کو اس پایے کے شاگرد نہ مل سکے جو ان کے علم کو محفوظ رکھ سکتے اور پھر تقدیرات الٰہیہ کی حکمتیں کون جان سکتا ہے؟

یہ حضرت الامام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ اپنے سے چھوٹوں سے بھی روایات بیان کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے یہ کاتب عبداللہ بن صالح مقام ومرتبہ کے اعتبار سے، ان سے چھوٹے تھے مگر انہوں نے انہی سے ایک راویت بیان کی ہے کہ عبداللہ بن صالح فرماتے تھے کہ ہمارے علاقے میں ایک لڑکی کی عمر نو سال کی تھی اور وہ اُمید سے تھی۔[2]

---

[1] حدثنا ابن أبي داود، حدثنا عبدالملك بن شعيب بن الليث، حدثني أبي حدثني الليث أن أبا صالح حدثه عن رجل أخبره أن ابنة له حملت وهي بنت عشر سنين . (الكامل فى ضعفاء الرجال، عبداللّٰه بن صالح، ابو صالح، كاتب الليث بن سعد مصري، رقم: ١٠١٥، ج:٥، ص:٣٤٣).

[2] حدثني الليث ، حدثني كاتبي عبداللّٰه بن صالح أن امرأة في جوارهم حملت وهي بنت تسع سنين. (ايضاً).

اس روایت پر غور کیا جائے تو اس لڑکی کی رخصتی یا تو نو برس میں ہوئی ہوگی اور وہ اسی سال اُمید سے ہوگئی ہوگی اور یا پھر وہ نو9 برس کی عمر سے بھی کچھ پہلے بالغہ ہوگئی ہوگی۔

امر واقعہ کچھ بھی ہو اس دور کی تاریخ میں ایسے واقعات کا بغیر کسی تنقید کے مل جانا، یہی بتا تا ہے کہ معاشرے میں اس طرح سے نسبت، ناطہ جاری تھا اور یہ رواج چنداں تعجب انگیز یا بُرا نہ مانا جا تا تھا۔

⑦ امام حدیث حضرت ابو عاصم ضحاک بن مخلد بن ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں شیخ المحدثین کہلاتے تھے۔ حضرت امام مالک، امام ارزاعی اور امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہم جیسے حضرات کے شاگرد تھے اور حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ اسحٰق بن راھویہ، حارث بن اسامہ، امام ذھلی، اور کوسج جیسے حضرات رحمہم اللہ تعالیٰ ان کے شاگرد تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ انہی کے متعلق فرماتے تھے کہ میں نے ان سے سنا، فرماتے تھے کہ مجھے جس دن سے یہ پتہ چلا ہے کہ غیبت حرام ہے اس کے بعد سے میں نے کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ جو شخص اتنا متقی ہو اس کی احادیث کیوں نہ سرمایۂ اُمت بنیں۔

انہی ابو عاصم ضحاک بن مخلد رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ بصرہ میں ہاتھی لایا گیا۔ لوگوں نے چونکہ ایسا عظیم الجثہ جانور دیکھا نہ تھا اس لیے بہت خلق خدا دیکھنے گئی ان کے استاد ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے شاگرد اور ان کے ہم سبق بھی، یہ تماشا دیکھنے گئے لیکن یہ ہمیشہ کی طرح سبق میں حاضر ہوگئے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے تعجب سے پوچھا کہ ابو عاصم "تمہیں کیا ہوا؟ ہاتھی دیکھنے نہیں گئے"۔ تو ابو عاصم نے عرض کیا کہ اگر آپ سے پڑھنے کا سبق ناغہ ہوگیا تو پھر اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ (ہاتھی تو پھر بھی دیکھا جاسکتا ہے) ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

انت نبیل تم تو نبیل (بہت سمجھدار، دانش مند) ہو[1]

---

[1] وقال البخاري: سمعت أبا عاصم يقول : منذ عقلت أن الغيبة حرام ، ما أغتبت أحداً قط. ....

ایسے متقی ، دانش مند ، اور متدین انسان امام ابو عاصم النبیل ضحاک بن مَخْلَدُ بن ضحاک رحمۃ اللہ علیہ خود اپنی پیدائش کے متعلق بیان فرماتے تھے کہ میں ربیع الاول ۱۲۲ھ میں پیدا ہوا تھا اور میری والدہ محترمہ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئی تھیں۔[1]

اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ والدہ صاحبہ اوران کے بیٹے کی عمروں میں (12=110-122) محض بارہ برس کا فرق تھا۔ والدہ صاحبہ کی رخصتی گیارہ برس کی عمر میں ہوگی اور پھر حضرت ابو عاصم النبیل رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت جب ہوئی ہوگی تو وہ بارہ برس کی ہوں گی۔

اس طرح کی جتنی بھی روایات کتب احادیث وتاریخ میں وارد ہوئی ہیں ان سب کا استقصاء مقصود نہیں بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ ہماری اس جدید دنیا میں یہ جو ایک نیا بُت اور صنم ''انسانیت'' کے نام سے روشناس کرایا جارہا ہے اور پھر اس خود تراشیدہ ، خدا کے پجاری ، اس کے نام پر کم عمری کی شادیوں کو ''کفر'' سے کم گناہ قرار دینے پر تیار نہیں ہیں انہیں قدیم تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ خود وحی بھیج رہا تھا اور دن بدن تازہ بتازہ ، نو بہ نو ، احکامات صادر ہو رہے تھے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں یوں ہی نسبت وناطہ جاری تھا۔ اگر یہ حرکت ایسی ہی شنیع وقبیح تھی ، جتنا کہ آج اس کا پرچار ہو رہا ہے اور جتنا کہ آج اس کے پرچارک ، اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ اس آگ سے خود ان کا بھی گھر جل رہا

......وروى أبو عبيد الآجري عن أبي داود قال: كان أبو عاصم يحفظ قدر ألف حديث من جيد حديثه، وكان فيه مزاح ويقال : إنما قيل له : النبيل ، لأن فيلاً قدم البصرة ، فذهب الناس ينظرون إليه، فقال له ابن جريج : مالك لا تنظر؟ قال : لا أجد منك عوضاً، قال : أنت نبيل . (سير أعلام النبلاء، أبو عاصم ، رقم: ١٧٨ ، ج:٩،ص:٤٨٢).

[1] قال عمرو بن علي الفلاس: سمعت أبا عاصم يقول : ولدت أُمي سنة عشر ومئة، وولدت أنا في سنة اثنتين وعشرين. (ايضاً، ص:٤٨٣).

ہے، بلا استثناء زبان وقلم کا بے موقع استعمال کر رہے ہیں، تو کیوں نہ اس کے امتناع کے لیے وحی الٰہی حرکت میں آئی اور کیوں نہ اس وقت کے معاشرے نے اس کا احتساب کیا۔

حالانکہ اس وقت کے معاشرے کی حالت یہ تھی کہ اس میں ہر طرح کے لوگ جی رہے تھے صرف وہی نہیں تھے جو حضرت صاحب الرسالۃ علیہ الصلاۃ پر ہزار جان سے نثار تھے، وہاں منافقین، یہود مدینہ اور مشرکین مکہ کے پورے پورے گروہ موجود تھے، جن کی کڑی نظریں ہر ہر لمحہ حضرت رسالت مآب ﷺ کا تعاقب کرنے کو ہر جا موجود تھیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے تھے کہ کہیں کسی بات کو بتنگڑ بنانے کا موقع ملے۔ حضرت ام المومنین سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح پر کیا ہوا تھا؟ ان کی شادی حضرت زید رضی اللہ عنہ سے ہوئی اور رہ وہ حضرت رسالت مآب ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ کے یہ منہ بولے بیٹے حضرت زید رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دیں اور پھر آپ کا نکاح آپ کی اس منہ بولی بہو کے ساتھ کر دیا جائے تا کہ عربوں کے معاشرے میں ان منہ بولے رشتوں کی بدرسم کی جو اہمیت —— حتی کہ اصل رشتوں سے —— بھی بڑھ گئی تھی، اس رسم بد کا خاتمہ کیا جائے اور وہ بھی آپ کے ہاتھوں ہی اس کا خاتمہ ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود آپ کا نکاح، ان منہ بولی بہو (جو کہ درحقیقت آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں) سے کر دیا۔

اس موقع پر منافقین مدینہ اور مشرکین مکہ نے جو طوفان بدتمیزی برپا کیا اور جو شور اٹھا ہے کہ "لو اب محمد (ﷺ) نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا" تو سرزمین عرب کا کون سا گوشہ تھا جہاں ان اعتراضات کی آواز نہ پہنچی ہو۔ مفسرین نے سورۂ احزاب کی تفسیر میں اور مؤرخین نے ۵ھ کے واقعات میں ان الزامات اور حقائق کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

تو وہ معاشرہ جو حضرت رسالت مآب ﷺ سے خار کھائے بیٹھا تھا، اس نکاح کے موقع پر یوں الزام تراشی پر اتر آیا جیسے کوئی پچھلا قرض چکانا ہے، تو کم سنی کی شادی اس معاشرے یا دور کے اعتبار سے کوئی اچھنبے کی چیز ہوتی تو یہ لوگ اور معاشرہ کوئی خاموش رہنے والے تھے؟ لیکن آپ تمام تاریخ کھنگال

جائیے مجال ہے کہ اس طرح کی تزویج پر کوئی ایک حرف اعتراض کسی نے کہا ہو یا کہیں سے کوئی ایک آواز بھی اس کی مخالفت میں اُٹھی ہو۔

یاد رکھنا چاہیے کہ معاشرے کا رواج، قانون سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسی سوسائٹی میں یہ رسم و رواج بغیر کسی روک ٹوک کے جاری تھا تو آج ڈیڑھ ہزار برس کے بعد انہیں مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے۔

سچ بولنا بڑا خطرناک ہے، سچ سے زیادہ کوئی شے کڑوی نہیں۔ سچ بہرحال سچ ہے۔ لیکن ہر وقت اور ہر مقام پر سچ بولنا مخصوص سیاسیات میں، مہلک بھی ہے اور مضر بھی! سچ کے لیے ہمیشہ دو کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک وہ جو سچ بولے، دوسرا وہ جو سچ سُنے۔ سچ تب ہی مکمل ہوتا ہے۔

یہاں سچ بولنے والے کم ہیں لیکن سچ سُننے والے کمیاب ہیں، بلکہ نایاب۔ اکثر سچائیاں صرف اس لیے ناکام ہوگئیں کہ ان کے پاس طاقت نہ تھی۔ بیشتر جھوٹ اس لیے سچ ہوگئے کہ انہیں طاقت نے پروان چڑھایا۔

''آخری فتح سچ کی ہوتی ہے۔'' ہمارے دور میں یہ مقولہ کبھی بار آور نہیں ہوا۔

''سانچ کو آنچ نہیں'' توفی زمانہ اس قسم کے خوبصورت فقرے کتابوں کے صفحات پر ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ حقائق سے ان کا برائے نام تعلق ہے۔ تاریخ بجائے خود کوئی شے نہیں۔ وہ ان حالات و واقعات اور حادثات و سانحات کے مجموعے پھر تجزیئے کا نام ہے جو ایک خاص عہد میں ایک خاص معاشرہ کو پیش آتے ہیں۔

آج کل سچائی قوت کی مرضی اور حق طاقت کی خواہش کا نام ہو گیا ہے۔

(آغا شورش کاشمیری، بوئے گل، نالہ دل، دُودِ چراغ محفل، ص:۱۹۵)

زندگی کا مقصد کیا؟

مفتی محمد سعید خان

دنیا ہی میں مرنے سے پہلے اس کا خمیازہ اس فرد، قوم اور معاشرے کو ضرور بھگتنا پڑے گا۔ خالص ریشم و کمخواب کی حسین و نفیس چادر کو کانٹوں کی باڑ پر رکھ کر کھینچ دیا جائے اور وہ تار تار ہو جائے تو یہ اتنا بڑا ظلم اور درندگی نہیں جتنا بڑا ظلم اور درندگی یہ ہے کہ انسان اپنے جینے کے مقصد سے بے خبر ہو اور پھر زندہ بھی رہے۔

مال و دولت، عزت و آبرو اور اپنی خواہشات کی جائز تسکین کی یکسر نفی کوئی عقلمند اور ذی شعور انسان نہیں کر سکتا مگر یہ حقیقت آخر کیوں نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے کہ یہ تمام اشیاء کسی خاص مقصد تک پہنچنے کیلئے وسائل اور ذرائع ہیں خود مقصود نہیں۔ آپ اس مسافر کی بد قسمتی پر کیسے ماتم کناں نہ ہوں جس نے اپنے سفر کا آغاز لاہور سے اس لئے کیا کہ وہ کراچی پہنچ سکے اور جب کراچی آئے تو وہ جہاز کی سیٹ سے چمٹ کر بیٹھ جائے اور بے جا ضد کرنے لگے کہ یہ سیٹ اسی کی ہے۔ حالانکہ یہ جہاز اور سیٹ تو کراچی پہنچانے کا ایک ذریعہ تھی مقصد تو کچھ اور تھا۔ بس اسی طرح جب کوئی فرد اور معاشرہ ذرائع، اسباب اور وسائل کو وہ اہمیت دینے لگے جو مقاصد کو دی جانی چاہیے تھی تو پھر اس اندھے پن سے اسے کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔ وہ تمام عمر انہیں اسباب و وسائل کے گرد کولہو کے بیل کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ رات دن اسی فکر میں رہتا ہے کہ دولت کیسے زیادہ ہو؟ عہدے کی دھاک کیسے بٹھائی جائے؟ اور اپنے نفس کی لذت و تسکین کیلئے کیا کیا ذرائع اختیار کئے جائیں؟ یہاں تک کہ وہ اس فکر سے بالکل محروم ہو جاتا ہے کہ یہ تمام اشیاء تو کسی مقصد تک پہنچنے کے لئے عنایت کی گئی تھیں اور میں نے اپنی حماقت سے ان

وسائل کو مقاصد کا درجہ دے دیا ہے۔ حتیٰ کہ موت کا الارم بج جاتا ہے اور وقت ختم ہونے پر اس کے نہ چاہنے کے باوجود امتحان کے اس ہال سے اسے جبراً الگ کر دیا جاتا ہے۔ موت کا خوف اس پر اس لئے بھی مسلط رہتا ہے کہ اس نے جن چیزوں کے ساتھ دل لگایا تھا اب وہ اس کے نہ چاہنے کے باوجود اس سے چھین لی جائیں گی اور مقصد کے خلاف زندگی گزارنے پر عتاب کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔

کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

حضرت شقیق بلخی اور حضرت ابراہیم ادھم رحمہم اللہ: ''حلیۃ الاولیاء''میں ابو نعیم اصفہانی نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم اور حضرت شقیق بلخی رحمہم اللہ کی ملاقات مکہ مکرمہ میں ہوئی ابراہیم بن ادھم نے شقیق بلخی سے دریافت کیا کہ گزراوقات کس طرح ہوتی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا جب اللہ تعالیٰ کچھ دے دیتے ہیں تو ہم بھی کھالیتے ہیں اور جب نہیں دیا جاتا تو صبر کرتے ہیں۔ ابراہیم ادھم فرمانے لگے ہاں بلخ کے کتے بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ شقیق یہ سن کر کہنے لگے اور حضرت آپ کی گذر کیسے ہوتی ہے تو ابراہیم ادھم نے جواب دیا جب کچھ مل جائے تو ہم ایثار وقربانی سے کام لیتے ہیں (اپنے سے زیادہ ضرورت مند بھائی کو دے دیتے ہیں۔) اور جب کچھ نہیں دیا جاتا تو بھی شکر اور حمد وثنا میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ سن کر شقیق اٹھ کھڑے ہوئے پھر ان کے مزید قریب ہو کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے میرے آقا در حقیقت استاد جو تربیت کرتا ہے وہ تو آپ ہی ہیں۔[1]

آپ غور کیجئے یہ دونوں اسی ایک جہاں میں رہتے تھے ایک ہی طرح کے حلیے اور شکل وصورت کے مالک تھے مگر ایک کی پرواز اور ذوقِ حیات کیا ہے اور دوسرے کی پَرواز اور ذوق حیات کا معیار کیا ہے؟ رحمہما اللہ تعالیٰ جمیعاً۔

جو انسان اپنی زندگی کسی مقصد کے تحت گزارتا ہے وہ کسی نہج اور ڈگر کا پابند ہوتا ہے اور جس کی زندگی بے

---

[1] ج:۸،ص:۳۷۔

مقصد ہوتی ہے وہ محض اپنے نفس کے تابع ہوتا ہے اس کا نفس اسے عبادت کی تلقین کرے تو وہ ایک دن میں پورا قرآن پاک بھی تلاوت کر لیتا ہے، پوری رات نوافل کی نذر کر دیتا ہے۔خرچ کرنے پر آئے تو گھر لٹا دیتا ہے، معافی کا رویہ ہو تو خون کے قاتل پناہ پا جاتے ہیں اور جب اس کا نفس اسے شر کی تلقین کرتا ہے تو کل تک جو جنید وشبلیؒ دھر نظر آتا تھا آج شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے۔جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے نفس کے کہے پر عمل کرنا اور حد سے گذر جانا بس انہی لوگوں کا خاصہ ہے جو بے مقصد زندگی گذارتے ہیں اور ان کا ہر عمل خیر وشر میں حدود(Limits) کا پابند نہیں ہوتا۔اعتدال نام کی چیز وہاں ڈھونڈے سے نہیں ملتی اور بامقصد زندگی بسر کرنے والے اس بے اعتدالی سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔

اس دنیا کی آبادی اربوں میں شمار کی گئی ہے ہر مذہب وملت کے لوگ بستے ہیں۔ان کی زندگی کے مقاصد کیا ہیں ان مقاصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں؟ وہ اپنے وسائل کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی زندگیاں کامیاب وکامران ہیں یا نہیں؟ ان تمام مباحث سے ہٹ کر سردست اہم مسئلہ تو یہ ہے کہ ایک مومن انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کی زندگی کا مطمع نظر کیا ہونا چاہیے؟ اسے کس ہدف تک پہنچنا اور کس منزل کو حاصل کرنا ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک مومن انسان کی زندگی کا اصل اور واحد مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشی کا حاصل کرنا ہے اور بس۔

الفاظ اور حقائق: ''اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشی'' لکھنے اور بولنے میں یہ محض پانچ الفاظ ہیں مگر ان کے پس پشت کیا کیا حقائق پوشیدہ ہیں اور اس عمیق واتھاہ سمندر میں غوطہ زنی کے لئے کس قدر ہمت درکار ہے بس اس کا اندازہ انہیں کو ہوسکتا ہے جنہوں نے اس میدان میں قدم رکھا ہو یا اپنی زندگی کا یہ مقصد

متعین کر کے پھر اس کے حصول کیلئے جدو جہد کی ہو۔ الفاظ اور حقائق کا کتنا گہرا تعلق ہوتا ہے اس کو اگر مثال سے سمجھنا مقصود ہو تو آپ یوں سمجھئے کہ عدالت یہ کہتی ہے کہ ''فلاں شخص فلاں کا باپ ہے''۔ چھ الفاظ پر یہ مشتمل جملہ اپنے اندر کتنے حقائق کو سموئے ہوئے ہے۔ اس کا پہلا مطلب تو یہ ہے کہ عدالت نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ یہ لڑکا جس خاتون کے ہاں پیدا ہوا ہے وہ خاتون اس شخص کی بیوی قرار پائیں۔ دوسرا مطلب یہ ہوا کہ اس لڑکے کی پرورش کا بوجھ اور نان ونفقہ کی ذمہ داری اس شخص کے فرائض میں شامل ہے۔ اس کا تیسرا مطلب یہ ہوا کہ اس شخص کی دیگر اولاد اس لڑکے کے بہن بھائی قرار پائیں گے۔ چوتھا مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص اس لڑکے کی تعلیم وتربیت کا قانونی طور پر پابند ہے اور اس جملے کا پانچواں مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں میں سے جو بھی پہلے انتقال کر جائے وہ دوسرے کی وراثت کا حق دار ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ کہنے کو ایک جملہ تھا مگر اس چھ الفاظ پر مشتمل صرف ایک جملے نے کتنے حقوق وفرائض کا تعین خود بخود کر دیا۔ بس بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشی کا حصول کہنے کو صرف ایک فقرہ ہے مگر مومن کا مقصد حیات ہے اور اس کی تمام زندگی کا اصل محور و مرکز بس صرف اور صرف یہ ایک ہی بات ہے۔ اسی کے حصول کیلئے تمام تگ ودو کی جاتی ہے اور سارے پاپڑ اسی لئے بیلے جاتے ہیں کہ یہ ''مقام رضا'' نصیب ہو۔

قرآن کریم میں مومن کی زبان سے اسی بات کا اقرار کروایا گیا ہے کہ وہ ڈنکے کی چوٹ، کھلے بندوں اور علی الاعلان یہ کہے کہ۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ . لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ .

(پ:۸، سورہ:الانعام ، آیت :۱۶۳۔۱۶۴)

بلا شک وشبہ میری نماز اور میری ہر طرح کی عبادت اور میری زندگی اور میری موت صرف اللہ ہی کیلئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (مقصد کے تحت زندگی گزارنے

کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کا فرمانبردار ہوں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جن کا اسوۂ حسنہ قابل اتباع اور جن کی زندگیاں مشعل راہ ہیں ان کی حالت یہی بیان کی گئی ہے کہ

تَرٰهُمْ رُكَّعاً سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَاناً.

تم انہیں جب دیکھو گے رکوع اور سجدے اور اللہ کا فضل اور اس کی رضا وخوشی کی طلب میں مصروف پاؤ گے۔

(پ:۲٦، سورہ:فتح ، آیت:۲۹)

مومن کی زندگی کا مقصد رضائے باری تعالیٰ ہی کا حصول جب ٹھہرا تو ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے سب سے بلند جس مقام اور آخری منزل کی خبر دی گئی تو وہ بھی مقامِ رضا ہی تھا کہ اس سے بلند و بالا کسی مرتبے کا تصور ممکن نہیں۔ انہوں نے اپنے مقصد حیات کیلئے جان کھپا دی اور زندگی لگا دی اسی لیے مالک حقیقی نے جب ان سے اپنی رضا وخوشی کا اعلان فرمایا تو انہیں ان الفاظ میں یہی نوید سنائی کہ تم اپنی زندگی کے مقصد میں کامیاب ہوئے اور تمہیں ہماری رضا نصیب ہوئی۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ط اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ. يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ. خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ.

(پ:۱۰، سورہ:توبہ ، آیت: ۲۰ ۲۱ ۲۲)

جو لوگ ایمان لائے اور اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی اور پھر اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا بڑا درجہ ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں ان کا پروردگار انہیں اپنی رحمت اور رضا وخوشی کی بشارت دیتا ہے اور ایسی جنتوں کی جہاں مستقل خوشی کے سامان ہوں گے اور یہ ان میں ہمیشہ رہیں گے بے شک اللہ کے پاس ان کاموں کا صلہ دینے کیلئے بہت کچھ ہے۔

اور یہ ''مقام رضا'' کچھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہی کیلئے مخصوص نہ تھا قرآن پاک کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی اگر کوئی شخص اپنی زندگی کا یہ مقصد بنا کر اس کیلئے حتی الوسع جدوجہد کرے تو ذات باری

تعالیٰ اسے اسی مقام رضا سے سرفراز فرمائے گی۔[1]

سورہ توبہ میں ارشاد ربانی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ.

(پ:۱۰، سورہ :توبہ ، آیت:۷۲)

اللہ کا وعدہ ہے ان مومن مردوں اور عورتوں سے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے درمیان میں نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور ان سدا بہار باغات میں ان کیلئے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشی و رضا انہیں حاصل ہوگی یہی بڑی کامیابی ہے۔

ان تمام آیات اور متعدد دیگر تصریحات سے اکابرین اُمت جو کچھ سمجھے ہیں وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشی ہر کام میں مدنظر رہے،بس مومن کی زندگی کا مقصد یہی ہونا چاہیے،اس کی زندگی کی تمام کاوشیں دنوں کی تمام جدوجہد اور راتوں کی تمام تگ وتاز حتیٰ کہ حیات مستعار کا نچھاور کردینا بس صرف اور صرف ان کی خوشی اور رضا کے حصول کے لئے ہونا چاہیے۔

مندرجہ بالا سطور میں مومن کا مقصد حیات جو بیان کیا گیا ہے اگر وہ درست ہے اور یقیناً درست ہے تو ہمیں ایک بار یہ جائزہ بھی لینا چاہیے کہ کیا آج ہم اس مقصد سے آشنا ہیں؟ اگر ہیں تو کیا ہم اپنی زندگیاں اس مقصد کے حصول کیلئے صرف کررہے ہیں؟ اگر ہم مقصد شناس تو ہیں مگر عمل میں کوتاہی ہے تو یہ ایک جرم ہے اور اگر سرے سے مقصد ہی سے بے خبر ہیں تو یہ دوسرا جرم ہے ہم سنبھل جائیں اور اس غفلت کا تدارک کرلیں وگرنہ مکافات عمل کے عالمگیر قانون سے استثناء محض خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔

---

[1] یہ خیال رہے کہ صرف مقام رضائے باری تعالیٰ کی بات ہورہی ہے نہ کہ مقام وشرف صحابیت کی کہ اس میں کسی کا ان کے بعد شریک وسہیم ہونا ناممکن ہے۔رضی اللہ عنہم جمیعاً۔اور دوسرے یہ مقام رضا بھی ان حضرات رضی اللہ عنہم کے لیے قطعی تھا البتہ بقیہ اُمت کے لیے ظنی طور سے ثابت ہوسکتا ہے۔

قدیم وجدید نسلوں کا باہمی موازنہ: ہم سے پہلے کی نسلیں ہم سے زیادہ پاکیزہ، بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی مالک تھیں، اس بات سے اتنا فرق نہیں پڑتا جتنا اس بات سے فرق پڑتا ہے کہ ہمارا معاشرہ کیسے افراد تیار کررہا ہے؟ اچھے لوگ جو با مقصد زندگی کے داعی ہوتے ہیں قدرت کا انعام ہے جو وہ اپنے بندوں پر نچھاور کرتی ہے اور جب ان کی مسلسل ناقدری ہونے لگے اور قومیں ان کے وجود سے فائدہ نہ اٹھائیں تو پھر اس انعام کا دروازہ بند بھی ہو جایا کرتا ہے۔ معاشرے سے جو نئی قیادت اُبھر کر سامنے آرہی ہے اس کی عادات واطوار کا عالم یہ ہے کہ ان میں ضبط کی صلاحیت مفقود ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ بات اگر ان کے مزاج اور طبع کے خلاف ہو تو وہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ذرائع ابلاغ انہیں اتنا مشتعل کررہے ہیں کہ وہ ایک لمحے میں فتنہ وفساد کی آگ پکڑ لیتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد رضائے الٰہی تو کیا ہوتا وہ تو انسانیت اور تہذیب کی حدود عبور کرنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ انہیں اپنی طبیعت پر کنٹرول نہیں، جوانی پر قابو نہیں۔ اور پھر مال ودولت کی فراوانی کو اللہ کا انعام سمجھ کر اس کی قدر تو کیا کرتے اس کی بجائے وہ اسے اعلیٰ سے اعلیٰ سامانِ آرائش وزیبائش اور عیاشیوں کے جہنم میں جھونک رہے ہیں۔ معاشرے کو یہ اندرونی بیماریاں گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں اور جو نسل سامنے آرہی ہے وہ قومی مفادات پر ذاتی مفادات کو ترجیح دینے والی ہے۔ ایسی نسل سے اچھائی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ با مقصد زندگی سے کوسوں ہٹ گئے ہیں اور وہ جدوجہد جو قوموں کی بقا کے لیے ضروری ہوتی ہے، اخلاص اور مردانگی جس کے اہم اجزاء ہوتے ہیں اس کے علمبردار کھو گئے ہیں۔ کیا ہمارے اسلاف ایسے ہی تھے؟ کیا کوئی ایک خوبی بھی ایسی ہے جس میں ہم ان سے آگے بڑھ گئے ہوں؟ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے دور میں دو نسلوں کا موازنہ کیا تھا جو آج بھی ایسے تروتازہ ہے کہ گویا وہ ان حالات کو ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح دیکھ

کر یہ نقشہ کھینچ رہے تھے۔نصف صدی سے زائد عرصہ بیت گیا مگر زمانے کی کوئی گرد اس مواز نے کو اپنی آلودگی کی لپیٹ میں نہیں لے سکی۔

ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے　　　تم مسلمان ہو ؟ یہ انداز مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نہ دولتِ عثمانی ہے　　　تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر
تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم　　　تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش ، کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم　　　پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم
تختِ فغفور بھی اُنکا تھا، سریر کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی
خود کشی شیوہ تمہارا وہ غیور و خود دار　　　تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار　　　تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی[1]

معاشرے کا انحطاط: بامقصد و باعمل زندگی تو در کنار عقائد تک میں اضمحلال ہے۔اللہ تعالیٰ پر بھروسہ، اس سے رحمت کی امید، اس سے درگذر کی توقع، آخرت میں جواب دہی کا احساس، قبر، حشر اور نامہ اعمال کے ملنے کا یقین، تقدیر پر ایمان اور مصائب و تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے اوصاف جس معاشرے میں بھی ہوتے ہیں وہ کبھی اتنا بانجھ نہیں ہوا کرتا جتنا کہ آج ہمارا معاشرہ ہو چکا

---

[1] کلیات اقبال، بانگ دراء، زیر عنوان جواب شکوہ، ص:۲۰۳

ہے۔

اخلاقیات کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ ہم نام نہاد مسلمانوں کا کردار، معاملات اور اخلاقی قدروں کے بارے میں اس قدر حوصلہ شکن ہے کہ کافر کردار کے معاملے میں مثال اور ہم بدنام کنندہ ہوتے جارہے ہیں۔ حسد، کینہ، ریاکاری، بغض، بخل، غیبت، بہتان تراشی، فضول اور بے کار کاموں میں دلچسپی، لاحاصل بحث، جھوٹی اَنا اور اس کی تسکین کے لایعنی حربے آخر کون سی بات ہے جو ہم میں نہیں ہے؟ اور کیا ان تمام باتوں کو ایک مومن کی بامقصد زندگی سے کوئی ادنیٰ درجے کی بھی مناسبت ہے؟ اسلاف سراپا کردار اور عمل تھے اور ہم ان کے نالائق جانشین محض ان کے قصے سنانے اور گپیں ہانکنے والے بھی اس وقت تک تھے جب تک کہ ہمارا علم اور مطالعہ ان کے بارے میں تھا اور جس دن سے علوم کی جگہ فنون، تعمیر کی جگہ تخریب اور آگاہی کی جگہ غفلت نے لی ہے ان کے کارناموں کا ذکر خیر بھی مٹ کر رہ گیا ہے۔ آپ عام عوام میں جا کر پوچھیے کہ صلاح الدین ایوبی کون تھا، رچرڈ کے ساتھ اس کا سلوک کس اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ تھا، معرکہ حطین کیا تھا؟ سقوط بغداد اور غرناطہ کی تباہی کا سانحہ کیوں کر بیتا؟ ابو حیان نے کیمیا میں کیا کیا؟ الشفاء اور القانون نے طب کی دنیا کو کیا دیا؟ ابن خلدون کے مقدمے نے تاریخ میں کیا ہر علم وفن میں کیا تہلکہ برپا کیا؟ معتصم کو صرف ایک مسلمان خاتون نے ایک عیسائی مرد کی زیادتی پر ہزاروں میل دور سے پکار کر کہا وامعتصماہ ہائے معتصم تیری دھائی ہے اور معتصم نے ''عموریہ'' کو کس سلطنت میں داخل کر دیا، کس قدر غیور مسلمان حکمران تھے؟ فارابی کندی اور بوعلی سینا کس اُمت میں پیدا ہوئے؟ عزالدین بن عبدالسلام، امام نووی، حافظ ابن حجر، عینی اور ابن ہمام کون تھے؟ یہ تو چھوڑیے کہ دور کی بات ہے آپ یہ پوچھ دیکھئے کہ ہمیں آزادی کیوں کر ملی؟ جبر واستبداد کی سیاہ رات کیسے کٹی؟ حریت کی سحر کیسے طلوع ہوئی؟ امیر المومنین سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک اور ان کے رفقا کار کون تھے؟ مولانا جعفر تھانیسری پر کالا پانی میں کیا بیتی؟ مالٹا میں حضرت شیخ الہند اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہما کس جرم میں پابہ زنداں رہے؟

کتنی تمناؤں، کتنی قربانیوں اور کتنی آہ والتجا کے بعد ''پاکستان'' کے نام سے ایک ٹکڑا کیسے حاصل ہوا، اس کی اصل تاریخ کیا ہے؟ پھر یہ ارض مقدس حاصل ہو جانے کے بعد مستحکم معیشت، صحیح نظام تعلیم، ارزاں و فوری انصاف کی ضامن عدلیہ اور وہ مقاصد جن کیلئے یہ خطہ حاصل کیا گیا تھا ان کے حصول کیلئے کون تھے جو پابند سلاسل ہوئے تو انہوں نے اپنے خون سے ''زنداں نامہ'' رقم کیا۔

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفت سایہ و دیوار و در میں جیتے ہیں

اس کو بھی لپیٹ رکھیے ان سے پوچھیے جنہیں اپنے ''پڑھا لکھا'' ہونے پر ناز ہے کہ مارکس کے سحر میں کیا تھا جس سے لاکھوں خاندان برباد ہوئے؟ ہیگل کے نام پر کیوں کلب (clubs) کھلے اور اس کی تعلیمات کیا تھیں؟ کانٹ نے کس علم کے کس شعبے کو کیا دیا؟ ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ جہالت کا غلبہ ہے۔ ان سوالات کا جواب اس پوری نسل کے ۵ فیصد کو بھی معلوم نہیں، موسیقی کی دھنیں انہیں یاد ہیں، فلمی دنیا سے مکمل شناسائی ہے، نفس پرستی ہے جذباتی فیصلے ہیں اپنے ناصح سے زیادہ غیر پر اعتماد ہے۔ جس نسل کو کچھ دینا چاہیے تھا وہ کیا دے رہی ہے اور جس نسل کو کچھ لے کر سیکھ کر مستقبل کی ذمہ داریاں سنبھالنے کیلئے تیار ہونا چاہیے تھا وہ کیا لے رہی ہے اگر آپ حقیقتاً تجزیہ کریں تو بجز انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھنے کے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

(باقی آئندہ شمارے میں)

فضائل الخلفاء الراشدين رضي الله عنهم

شَهِدتُ بأنّ اللّه لا رَبَّ غيرُهُ
وأشهدُ أنَّ البَعثَ حَقٌّ وأخلَصُ

وأنَّ عُرَا الإيمانِ قولٌ مُبيَّن
وفعلٌ زكيٌّ قد يزيدُ وينقُصُ

وأنَّ أبا بكرٍ خليفةُ ربِّهِ
وكان أبو حفصٍ على الخَير يَحرِصُ

وأُشْهَدُ ربّي أنَّ عثمانَ فاضِلٌ
وأنَّ علِيّاً فضلُهُ مُتَخَصِّصٌ

أئمَّةُ قومٍ يُهتَدَى بهُداهُمُ
لَحَى اللّه مَن إيّاهُم يَتَنَقَّصُ

فما لغُواةٍ يشتمُون سَفَاهةً
وما لسَفيهٍ لا يحيصُ ويخرصُ؟!

ديوان الامام الشافعي، ص: ٧٠، دارالمعرفة، بيروت.